سیاحتِ جرمنی کے مشاہدات

(از محمد المبارک۔ پرنسپل شریعت کالج، شام)

دو ماہ قبل مجھے مختلف اسلامی ممالک کے ایک نمائندہ وفد میں فیڈرل جرمنی جانے کا موقع ملا اس دورے میں ہم نے میونخ، ہینوور، منسٹر، بون، ہمبرگ اور مغربی برلن وغیرہ شہروں کی سیاحت کی۔ جرمنی کی سیاحت کرنے والا جب وہاں کے فکری ڈھانچہ اور سیاسی و اقتصادی نظام اور جدید تقاضوں کے ساتھ اس کی ہم آہنگی کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنا کر سیاحت کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی میں ایک ایسا سماجی تجربہ کیا جا رہا ہے جو حیرت انگیز بھی ہے اور مفید بھی۔ جرمنی ایک ایسے کٹھن تجربے سے گزرا ہے جس کے نتائج سے وہ آج تک پیچھا نہیں چھڑا سکا ہے۔ جرمنی قوت و شوکت اور خود کفالت کی بلندی سے کمزوری اور بٹوارے کی پستی میں آگرا۔ اسے ان قوموں کا تابع فرمان بننا پڑا جن کو جرمنی بلحاظ عبقریت و حیثیت اپنے سے کمتر سمجھتا تھا۔ اس لیے کہ جنگ سے پہلے نازی عہد میں جرمنی کی مادی اور ذہنی قوتوں کو اس عقیدے کی بنیاد پر پروان چڑھایا گیا تھا کہ جرمن نسل نہ صرف ایک متمدن نسل ہے اور غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک ہے بلکہ وہ اس بات کی بھی حقدار ہے کہ دوسری قوموں پر جو بہر حال اس سے کم تر ہیں، اُسے بالادستی حاصل رہے۔ جرمنی کی فوجی طاقت، صنعتی نظام اور تنظیمی قوت حیرت انگیز حد تک اوج کمال پر پہنچ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ نسلی برتری کا احساس اور طاقت و بالادستی کا گھمنڈ بھی آخری حد کو چھونے لگا تھا۔ یا تو یہ حالت تھی اور یا جنگ کے خاتمے کے بعد وہی جرمنی کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ اور اس پر چار ملکوں کی فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ اس کے تمام بڑے بڑے شہروں کی گنجان آبادیاں، صنعت و حرفت اور چہل پہل یکایک کھنڈروں اور ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں یہاں تک کہ بعض شہروں میں تباہی کی اوسط نوے فی صد تک پہنچی ہے۔ مکانات جو منہدم ہوئے

ان کی تعداد ساٹھ لاکھ تک پہنچتی ہے۔ معاشی بدحالی عام ہو گئی۔ جانی نقصان ستر لاکھ سے متجاوز تھا۔ قیدیوں کی تعداد ساڑھے تیس لاکھ تک اور تارکینِ وطن کی تعداد ایک کروڑ پچاس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ مزید برآں سرزمینِ جرمنی کے حصے بخرے کر دیئے گئے۔ یعنی مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی، جرمنی کا وہ حصہ جو پولینڈ کے ساتھ ملحق کیا گیا اور وہ حصہ جو سوویٹ روس کے ساتھ ملایا گیا۔ پھر برلن شہر کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے گئے۔ جرمنی کی یہ تقسیم آج تک قائم ہے۔ جنگ کے دوران اور بالخصوص شکست کے بعد جرمنی کو اپنی ہمسایہ اقوام اور فاتح افواج کے ہاتھوں قتلِ عام، آبروریزی، وحشیانہ مظالم اور تاخت و تاراج کے جن ہولناک المیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے اس کے ذکر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور تاریخِ انسانی کے تاریک ادوار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

ان مصائب و آلام اور تلخ تجربوں نے جرمنوں کو اپنی فکری بنیادوں اور سیاسی و اقتصادی نظریات پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اور ان نظریات کو موردِ تنقید بلکہ موردِ ملامت ٹھیرایا جو قومی انانیت و تکبر اور نسلی عصبیت پر مبنی تھے کیونکہ یہی تو وہ نظریات تھے جنہوں نے دوسری قوموں کے جذبۂ غیرت و حمیت کو ان کے خلاف بھڑکا دیا تھا اور ان کے دماغ میں غرور کی ہوا اس قدر بھر دی تھی کہ دوسری قوموں کے ساتھ برادرانہ تعاون اور اشتراکِ عمل کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ ان قوم پرستانہ نظریات نے جرمنی کے اندر ایک شدید نوعیت کے آمرانہ اور مستبدانہ نظامِ حکومت کو جنم دیا تھا۔ ایسے نظام میں قوم کا سربراہ ہی اصل مرکز ہوتا ہے کیونکہ وہ معاشرے کی روح کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایسے نظام میں افراد کا نہیں بلکہ اس معاشرے کا اصل اعتبار ہوتا ہے جس کا مظہر سربراہ کی ذات ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے افراد کو فنا کے گھاٹ اتار دینے میں کوئی دریغ نہیں کیا جاتا جو معاشرے سے ہم آہنگ نہ ہو رہے ہوں۔ اس وجہ سے جرمنوں نے کمیونزم کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا کیونکہ ایک تو اس لیے کہ یہ ان کے فاتحین کا مذہب تھا اور دوسرے اس وجہ سے کہ ان کے نزدیک کمیونزم ہی جرمنی کے اتحاد و اتفاق کی راہ کا روڑا تھا۔

کمیونزم اور تنگ نظرانہ قوم پرستی کا ردِ عمل ایک طرف روحانی اقدار کے احیاء اور دوسری

طرف غیر قوموں کے ساتھ تعاون کی صورت میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیساؤں میں از سر نو زندگی پیدا ہو گئی اور وہ اپنے سابقہ بُعد اور اختلاف کے علی الرغم ایک دوسرے کے قریب تر آ گئے ہم نے ایسے بہت سے کلیسا دیکھے جو نئے تعمیر شدہ تھے اور جنکی تعمیر میں نئی نقطۂ نظر سے نئی اصلاحات جھلکتی ہی تھیں۔ بلکہ بعض کلیساؤں کی تعمیر میں تو کھلم کھلا ان قدیم روایات اور قدامت پرستانہ طرز تعمیر سے انحراف کیا گیا ہے جو کیتھولک کلیساؤں کے ہاں جاری وساری رہا ہے۔ یہ مذہبی روح صرف کلیساؤں ہی کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ یونیورسٹیوں، فوجوں اور سماجی بہبود کے بیشتر اداروں میں بھی کارفرما ہے۔

ہم نے دیکھا کہ ہر جرمن ان مصائب و آلام کی تلخی کا شدید احساس رکھتا ہے جنہوں نے اس کے وطن کو ویران کر دیا، اس کے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، اسے فاتحین کے قدموں کی جولانگاہ بنا ڈالا اور ان کے نفوذ و اقتدار کے پنجہ میں دے دیا۔

چنانچہ ہر جرمن اپنے ملک کو ان مصیبتوں کے پنجہ سے چھڑانے کے لیے پیہم سرگرم عمل ہے جرمن قوم نے بہت ہی تھوڑے عرصہ میں اپنے شہروں کو جن کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی از سر نو تعمیر کر لیا ہے۔ انہوں نے اپنے عظیم الشان کارخانے بھی نہ صرف یہ کہ دوبارہ قائم کر لیے ہیں بلکہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑے بنالئے ہیں۔ اور یہ تو خیر معمولی بات ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسا کامیاب اقتصادی نظام استوار کر لیا ہے جو بیک وقت آزاد اور زیر نگرانی (CONTROLED) معیشت کی کامیابی کے لیے نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جرمنی میں یہ نظام بار آور ہو چکا ہے اور آج جرمنی کی مصنوعات اپنی عمدگی و نفاست اور مضبوطی کی قدیم روایات کے ساتھ تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔

جرمنی کا یہ معاشی نظام چار اصولوں پر قائم ہے۔

(۱) آزاد انفرادی سرگرمیوں کے لیے پوری گنجائش رکھی گئی ہے۔ افراد کو ابھرنے اور اپنی محنت سے نفع اندوز ہونے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیونکہ نفع اور باہمی مقابلے کی خواہش انسان کی فطرت میں داخل ہے۔

(۲) ایک طرف انفرادی آزادیٔ عمل کو برقرار رکھا جاتا ہے اور دوسری طرف ذخیرہ اندوزی کی اجازت نہیں دی جاتی جو سرمایہ دار ممالک میں عام طور پر رائج ہے۔

(۳) عمومی آسائش اور سہولیات تمام قوم کے لیے کھلی ہوئی ہیں۔ چنانچہ ہر شخص بیماریوں کے لیے علاج اور بچوں کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے علاوہ وہ ساری ضروریات بڑی آسانی سے پوری کر سکتا ہے جو ایک متمدن معاشرے میں معلوم و معروف ہوتی ہیں۔

(۴) اس نظام کے تحت ملک میں متزاید محصول (PROGRSSIVE TAXATION) کا اصول رائج ہے جس کی وجہ سے روزگار عام ہے اور عوام کا معیارِ زندگی بلند ہو گیا ہے۔ ان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی اور مفادات کی ضمانت دی جاتی ہے۔ اسی اصول کی برکت سے جرمن قوم کی شرح ٹیکس دنیا کی دوسری تمام قوموں کی شرح سے زیادہ ہے۔ کیونکہ ایک جرمن اوسطاً چودہ سو مارک سالانہ ٹیکس ادا کرتا ہے۔ گویا متزاید محصول کا تناسب ۵ء۶۵ ٪ تک پہنچ جاتا ہے۔

جہاں تک بیرونِ ملک اس نظام کی کامیابی کا تعلق ہے تو اس کے ثبوت میں جرمن کرنسی کی قوتِ مبادلہ اور اس کی ساکھ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس نظام کی کامیابی کی بدولت ہی جرمنی اپنی مصنوعات برآمد کرنے پر نہ صرف یہ کہ قادر ہو سکا ہے بلکہ آج جرمنی دنیا کے برآمد کنندہ ممالک کی صفِ اول میں کھڑا ہے۔ وہ دوسرے ممالک کے دوش بدوش اقتصادی اعتبار سے پسماندہ ممالک کی امداد کرنے والے بین الاقوامی اداروں کو قرضے جاری کرتا ہے اور سرمایہ کی فراہمی میں حصہ لیتا ہے۔ اندرونِ ملک بھی یہ نظام نہایت کامیابی سے چل رہا ہے چنانچہ آپ کو سارے ملک میں ایک شخص بھی فقیر و محتاج نہیں ملے گا۔ بلکہ اس کے برعکس قوم کے تمام طبقات کا معیارِ زندگی اس حد تک بلند ہو چکا ہے کہ دوسرے ملکوں میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر فرد کام کاج اور مقدور بھر ترقی کرنے کی پوری آزادی محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ حکومت خود نہ کوئی کاروبار کرتی ہے اور نہ کاروباری اداروں کو اپنی ملکیت میں لیتی ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ایک طرف ناجائز نفع اندوزی اور ذخیرہ اندوزی کو روکتی ہے اور دوسری طرف ملک کے اندر روزگار اور مفادِ عامہ کے اداروں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دیتی ہے۔

چنانچہ پیشہ طبابت عملاً قومی تحویل کے حکم میں ہے یعنی مزدوروں اور طالب علموں وغیرہ کی انجمنوں کی طرح وہاں ایسی منظم انجمنیں قائم ہیں جن میں قوم کا ہر فرد داخل ہو سکتا ہے۔ ان انجمنوں کو معمولی سی معینہ رقم کے عوض علاج کی ضمانت دی جاتی ہے۔ اس طرح بکارت علاج بھی سستا ہو گیا ہے اور حکومت کو کوئی ضرورت اس بات کی نہیں رہی ہے کہ وہ نیشنلائزیشن کے اصول کو باقاعدہ طور پر اپنائے بلکہ اس کے برعکس حکومت نے مشہور موٹر ساز کارخانہ (فاکس ویگن) کی طرح کے بڑے بڑے کارخانوں کو جو پہلے قومی ملکیت میں تھے آزاد کر دیا ہے اور انہیں مشترکہ سرمائے کے کاروباری اداروں (JOINT STOCK COMPANY) کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔

درحقیقت جرمنی کا اقتصادی نظام اس قابل ہے کہ وہ تمام ترقی پذیر ممالک جو آج اپنا اقتصادی ڈھانچہ تیار کرنے میں مشغول ہیں اس نظام کا گہری نظر سے جائزہ لیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسا کامیاب نظام ہے جس نے مختلف اقتصادی نظاموں کے محاسن کو جمع کر لیا ہے اور ان کے معائب سے دامن بچایا ہے۔ یہ نظام افلاس اور بے روزگاری کا قلع قمع کرنے کی پوری اہلیت رکھتا ہے۔ اس نظام کے ذریعہ سے قومی اور انفرادی آمدنی بڑھائی جا سکتی ہے۔ اور انفرادی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے آرام و آسائش اور خوشحالی عام کی جا سکتی ہے۔ اس طرح شہریوں کو ریاست کے بوجھ، تشدد اور اپنی آزادی پر ایک ایسی قدغن کے احساس سے بھی محفوظ رکھا جا سکتا ہے جو انہیں محض پیداوار کی خاطر مشین کا ایک بے جان پرزہ یا ایک تابع مہمل جانور بنا ڈالے۔

آخر میں برسبیلِ تذکرہ اس چیز کی طرف بھی اشارہ کیے دیتا ہوں جو اگرچہ دوسرے لوگوں کے نزدیک ترجانی پہچانی ہے مگر ہم اسے یاد رکھنے کے سب سے زیادہ محتاج ہیں۔ یورپ میں بالعموم اور جرمنی میں بالخصوص دیکھا جاتا ہے کہ ہر شخص دوسرے شخص کے حقوق کا احترام کرتا ہے۔ کوئی شخص کسی کے حق پر دست درازی نہیں کرتا اور اسے ایسا کرنے سے باز رکھنے کے لیے پولیس یا قانون کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بات صرف افراد کے باہمی حقوق ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ عام نظم و نسق اور پبلک مقامات مثلاً باغات اور تفریح گاہیں بھی ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رہتی ہیں۔ چنانچہ دن اور رات میں کسی بھی وقت

کسی باغ میں اگر آپ چلے جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ کوئی شخص نہ کسی پھول کو توڑتا ہے اور نہ کسی پرندے کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ وہاں انواع و اقسام کے پھول کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور طرح طرح کے پرندے پنجروں میں بند ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہاں چپے چپے پر چوکیدار موجود ہوں بلکہ لوگوں کے ضمیروں میں از خود وہ حس موجود ہوتی ہے جو انہیں اس اجتماعی سرقے سے روکتی ہے۔ اسی طرح جب ٹریفک گزر رہا ہو تو آپ کسی کو سڑک پار کرتے ہوتے نہیں دیکھیں گے اور نہ کسی ایسی شارع عام کے درمیان کسی کو چلتا ہوا پائیں گے جو صرف موٹروں کے لیے مخصوص ہو۔ علیٰ ہذا القیاس ازدحام کے مقامات پر کوئی شخص گھس مار کر آگے بڑھ جانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ ترتیب اور نظم کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ کوئی دکاندار سستی چیز آپ کے ہاتھ مہنگے داموں فروخت نہیں کرے گا۔ نہ قیمت کے بارے میں دھوکا دینے یا جھوٹ بولنے کی کوشش کرے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ باتیں خواہ وہ تعلم و نسق سے متعلق ہوں یا لوگوں کے حقوق کی حفاظت سے، اور خواہ اجتماعی حقوق سے تعلق رکھتی ہوں یا کاروباری اخلاق سے متمدن زندگی اور وحشیانہ زندگی کی کسوٹی ہوتی ہیں۔ اخلاق کے وجود اور عدم کا پتہ انہیں باتوں سے لگتا ہے۔ بہتر ہو گا کہ ہم جن کی سرزمین میں آسمانی کتابیں نازل ہوئیں اور مذہبی تعلیمات کا غلغلہ بلند ہوا اور جن کے اسلاف کا طرۂ امتیاز مکارمِ اخلاق تھا اپنے آپ کو ذرا ان کسوٹیوں پر بھی پرکھ کر دیکھیں۔

جرمنی کے بیس روزہ مختصر سے دورے میں جو کچھ دیکھا اس میں سے کچھ بطور مشتے از خروارے اس امید پر اپنی قوم کے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کر دیا ہے کہ شاید وہ اس میں اپنے لیے عبرت اور نصیحت کا کوئی سامان پا جائیں۔ اور اس کے ذریعہ سے ترقی کی راہ کے تجربات میں ہمیں ایک گونہ مدد مل جائے کیونکہ مختلف قوموں کے تجربات خواہ وہ کسی بھی مذہب سے وابستہ ہوں، ہماری قوتِ فکر و عمل کے افق کو وسعت بخشتے ہیں۔ ہمیں اپنی اقتصادی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لیے دنیا کے رائج الوقت نظاموں میں سے کسی خاص نظام پر اپنی نگاہیں نہیں مرکوز کر لینی چاہییں اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بس ایک وہی نظام ایسا ہے جس میں قوم کے لیے خوش حالی کا مژدہ ہے افراد اور قوم کے

. . . . . ہر طبقے کے لیے انصاف کی ضمانت ہے چاہے اس میں آزادیوں کا گلا ہی کیوں نہ گھونٹ دیا جائے اور دین اور روحانی اقدار کا کلی استیصال ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔

پھر یہ بات بھی تو ہے کہ یہ مختلف تجربات مختلف مفید تدابیر کی جانب ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ حدیث نبوی ـــ الحکمۃ ضالۃ المؤمن" کی رُو سے دانائی کی بات مومن کی متاعِ گم شدہ ہے۔ (ماخوذ از حضارۃ الاسلام) ترجمہ: عمر فاروق مودودی

رمضان المبارک ـــ کی ـــ خوشی میں

تفہیم القرآن کی قیمتوں میں خصوصی رعایت

ہم رمضان المبارک کی خوشی میں نہایت مسرت سے اعلان کرتے ہیں کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن کے سلسلے میں درجِ ذیل خصوصی رعایت دی جائیگی

جلد اول۔ سورہ فاتحہ تا سورہ الانعام	۲۱ ـ ۲۵
جلد دوم۔ سورہ الاعراف تا بنی اسرائیل	۲۲ ـ ۷۵
جلد سوم۔ سورہ الکہف تا سورہ الروم	۲۷ ـ ۵۰
محصول ڈاک	۴ ـ ۵۵
	۷۶ ـ ۰۵
خصوصی رعایت	۶ ـ ۰۵
	۷۰ ـ ۰۰

اس کے ساتھ ہی ایک سال کے لیے ماہنامہ "تعمیر انسانیت" مفت جاری کر دیا جائے گا جس کا سالانہ چندہ ۵ روپیہ ہے۔

مکتبہ تعمیرِ انسانیت۔ موچی دروازہ لاہور